ساحرلدھیانوی کی نظم گوئی کا مابعدنوآبادیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ساجد جاوید*

Abstract:

Sahir Ludhyanavi burst into the 20th century Urdu literary world with his different progressive voice. In colonial period his poetic work Talkhian proved a rebel. He presented the socio-economic changes of Subcontinent in humanistic and nationalist perspective in his poems. He represented the exploitations of humans from different angles. His poetry is an excellent example of anti-colonialism. In this article it is shown that Sahir's poetry proves that the colonized is civilized instead of the colonizer.

پسِ نوآبادیاتی عہد میں ہندوستان کے مقبوضہ علاقوں کا سماجی، سیاسی اور معاشرتی جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز قوم ہندوستان کے خطے کے عوام کے لیے چند ایک مثبت انداز کی اصلاحات پر عمل پیرا تھی۔ جس کا مقصد مفتوحہ علاقے کے لوگوں کے اندر سے ایک تو اس دوری کو ختم کرنا تھا جو ان کے اور انگریزوں کے مابین تھی۔ دوسرا ایسا نظام حکومت لاگو کرنا تھا جو اس سے قبل مغل عہد میں ان کو نصیب نہ ہوا تھا۔ وجہ صاف تھی جب مکمل حکمرانی ان کے ہاتھ آئے تو مقامی افراد اور نئے حکمرانوں کے درمیان مغائرت کی گنجائش نہ ہو۔ لیکن اس سارے منظرنامے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جسے انگریز نے غدر/ بغاوت سے تعبیر کیا ہے) کا سانحہ وقوع پذیر ہوا۔ اس بغاوت کو انگریز نے سختی سے کچل تو دیا لیکن یہ سبق لیا کہ مقامی افراد سے اچھا سلوک انگریز کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ موقع ملنے پر مقامی باشندے کسی نہ کسی شکل میں ان کے لیے مسائل پیدا کریں گے۔ چنانچہ اس سانحے کے بعد

* شعبہ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

نو آبادیاتی دور میں حکمرانوں نے اس بدقسمت ملک پر نئے اصول ضابطوں سے حکمرانی کرنے کا منصوبہ بنایا جس نے ہندوستان کے سماجی، معاشرتی، معاشی، تمدنی، تعلیمی اور انسانیت جیسے اداروں کا ڈھانچہ مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ نو آبادیاتی دور (۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء) تک تقریباً نوے سال جاری رہا، جس میں اوپر مذکور متنوع جہات میں ایسی ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جن کے اثرات آج کے مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی مورخ اور ادیب کے لیے مطالعہ کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ نو آبادیاتی عہد میں انگریز حکمرانوں نے جو رہنما اصول تشکیل دیے ان میں سے اہم یہ ہیں :

i۔ حکمران اور رعایا کے درمیان فاصلہ ضروری خیال کیا گیا۔

ii۔ حکمران کا، لے پالک طبقہ پیدا کیا گیا جو عوام اور حکمرانوں کے درمیان رابطے اور استحصال کا ذریعہ بنا۔

iii۔ منصبداری اور تعلقداری نظام کی جگہ نسل در نسل منتقل ہونے والا جاگیرداری نظام لاگو ہوا۔

iv۔ ملوکیت کے مظاہر اور سرمایہ دارانہ نظام کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

v۔ مذہب کی طاقت کو سمجھتے ہوئے اس سے وابستہ اشخاص کو کھلی چھٹی دے دی گئی جو آگے چل کر مختلف انداز سے افراد کے استحصال کا ذریعہ بنی۔

vi۔ مقامی تمدن و تہذیب کو بدل دینے کی کامیاب سعی کی گئی۔

vii۔ نئے حکمران مہذب بتائے گئے اور مقامی افراد کو غیر مہذب، وحشی اور جاہل ہونے کا احساس دلایا گیا۔ جن کو تہذیب سکھانا فریق اول کے ذمے ہوا۔ مقامی فرد کو کمتر سمجھنے کے رویے پر ایڈورڈ سعید کا یہ تبصرہ خاص اہمیت کا حامل ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''نو آبادیاتی تقسیم کی ایک طرف سفید فام مسیحی یورپ تھا جس کے متعدد ممالک کرۂ ارض کے زیادہ تر علاقے پر مختار تھے۔ دوسری طرف علاقوں اور نسلوں (سبھی گھٹیا، کمتر، منحصر اور مطیع) کا ایک وسیع و عریض تنوع تھا۔ آئرلینڈ اور آسٹریلیا جیسی ''سفید فام'' نو آبادیوں کو بھی کمتر انسانوں پر مشتمل خیال کیا اور بدیہی طور پر آئرش سفید فاموں اور جمیکائی سیاہ فاموں کو ملا دیا گیا۔ ہندوستان اور دوسری جگہ پر سفید فام اور غیر سفید فام کے درمیان تقسیم قطعی تھی اور کِم (Kim) کے علاوہ رڈیارڈ کپلنگ کی دیگر تحریروں میں بھی اس کی جانب اشارہ ملتا ہے؛ صاحب ایک صاحب ہے، اور دوستی یا ساتھ نسلی فرق کی باقیات کو کبھی نہیں مٹا سکتا۔''(۱)

مذکورہ عوامل کو قابل عمل بنانے کے لیے طاقت اور تشدد کو معاشرے میں بڑھاوا دیا گیا جس کے نتیجے میں سپاہی (پولیس) اور فوجی ادارے خوف اور تشدد کی علامت بنے۔ ان عوامل کی وجہ سے برصغیر کے عوام میں خوف، دہشت، مفلسی اور عدم تحفظ کا احساس شدت اختیار کرتا گیا اور سماج کا تمدنی ڈھانچہ بگڑتا چلا گیا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم کی صورت میں ادیبوں نے نو آبادیاتی عہد کی ان بدعتوں کے باعث سماج کے

غیر متوازن ڈھانچے کی کریہہ شکل وصورت کا ادراک کیا اور ادیبوں نے ان عوام کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔اس تحریک سے تعلق رکھنے والے اہم شاعر ساحرلدھیانوی نے اس صدی کی چوتھی دہائی میں اپنی نظموں میں استحصال شدہ عوام،ان کے مسائل اور تیزی سے تبدیل ہوتی اس معاشرتی فضا کی جاندار جھلکیاں اپنی شاعری میں پیش کیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے مابعدنوآبادیاتی عہد میں ساحرلدھیانوی کی نظموں کا مطالعہ ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ اور سماجیات کے شعبوں کے طالب علم کے لیے سودمند ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں ردِنوآبادیاتی رویے کا شدت کے ساتھ مظاہرہ کیا۔انکی کتاب تلخیاں ردِنوآبادیاتی پڑھت کی بہترین مثال ہے۔ذیل میں ان کی نظموں میں ان تمام اہم موضوعات کا مطالعہ پیش ہے جوانہوں نے کالونیل دور کی نام نہاد مہذب حکومت کے مکروہ افعال کی وجہ سے محسوس کیے۔ان موضوعات کی پیش کش سے ساحرلدھیانوی کا انسان دوستی اور ترقی پسندی کا بہترین روپ قاری کے سامنے آتا ہے جوایک منفرد لہجے میں غمناک سچائیوں اور تلخیوں کا مرقع ہے۔

.....

ترقی پسند شعراء کے ہاں وطن سے محبت،انسان دوستی اورانسان کا استحصال کرنے والے مختلف عناصر کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ساحر نے انسان دوستی کے مینی فیسٹو پر اپنی شاعری کے موضوعات کی بنیاد مستحکم کی۔ عام طور پر،مورخ اور ادیب لوگ ۱۸۵۷ء کے بعد کے زمانے میں ہونے والے ظلم وستم کے واقعات وشواہد کو موضوع بناتے ہیں لیکن ساحر نے انگریز آمد سے قبل،مغل عہد میں بھی مغل حکمرانوں کے جبر واستبداد اور استحصال کی طرف طنزیہ نظر کی۔ان کی نظم 'تاج محل اس انسان دوستی کا پہلا منظر نامہ بنتی ہے جہاں ایک بادشاہ نے عوامی ٹیکسوں سے چھینی گئی دولت کو محض ایک محبوب کی قبر بنانے کے لیے ایک عمارت کے جنم میں جھونک دیا۔

مری محبوب ! کہیں اور ملا کر مجھ سے　　بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوت شاہی کے نشاں　　اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر　　ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق (۲)

تاج محل کی عمارت ساحر کے دل کو نہیں لبھاتی بلکہ اس کی خوبصورتی اور شکوہ ساحر کو دہشت زدہ کر دیتا ہے کہ کس طرح انسانوں کے استحصال سے یہ عمارت بنائی گئی ہے۔اس عمارت کے متوازی غریب کا جھونپڑا بڑی شدت کے ساتھ اس کو انسان کی بے وقعتی کا احساس دلاتا ہے۔ہمارا شاعر اس عمارت کی بنیادوں میں اپنے اجداد کا خون دیکھتا ہے۔یہ نقطہ نظر کسی بھی طرح نوآبادیاتی تفہیم سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ جو مظالم نوآبادیاتی عہد میں ہوئے ان سے قبل کے حکمرانوں کے مظالم کو بھی ساحر اپنی شاعری میں نہیں بھولتا اور ایک طنز نگار کے طور پر اپنے قلم کے نشتر برساتا ہے۔

انگریزوں نے حکمرانی کا باقاعدہ آغاز انسان کی درجہ بندی سے کیا۔ انسانوں کی اونچ نیچ کو بڑھاوا دینا ان کی سیاسی مجبوری ہوسکتی ہے لیکن یہ اقدام ان کے اس دعوے کی کھلم کھلا نفی تھی جس میں انہوں دنیا کو یہ تاثر دیا تھا کہ انگریز قوم مہذب ہے اور مقامی افراد وحشی، غیر مہذب اور کمتر۔ اور یہ کہ انگریز حکمران دراصل ان کو مہذب بنانے کے لیے ہندوستان پر حاکم ہوئی ہیں۔ اس پر ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں،

> ''نو آبادیاتی طاقتیں، مقامی لوگوں کو انسانیت کے درجے سے گرا کر انہیں وحشی اور جانوروں کی صف میں لا کر اخلاقی طور پر سمجھتے ہیں کہ چونکہ وہ مہذب برتر اور افضل ہیں اس لیے خدا نے انہیں فتح دی ہے اور ان لوگوں کو ان کی ماتحتی میں دیا ہے۔ برتر اور اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ ان کی زمین پر قبضہ کریں، ان کی جائیدادوں کو ہتھیا لیں اور ان کے مال اور ان کی دولت کو چھین لیں۔ اور انہیں مجبور کریں کہ وہ ان کے مقاصد کے تحت کام کریں۔ اگر مقامی لوگ ان کے منصوبوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو یہ نہ صرف سامراجی طاقت سے غداری ہے بلکہ خدائی احکامات کی بھی خلاف ورزی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں ان کو قتل کرنا، اذیت دینا اور سزا دینا اخلاقی طور پر صحیح ہے۔''(۳)

اس پہلو کو ساحر نے اپنی نظم مادام کے ان شعروں میں طنزیہ پیرائے میں استعمال کیا ہے۔

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام — لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے

میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہو گی — میرے ماحول میں ،انسان نہ رہتے ہوں گے (۴)

نو آبادیاتی عہد میں انگریز حکمرانوں نے انسانوں کو مختلف سطح کی درجہ بندیوں میں تقسیم کر دیا۔ تقسیم یہاں کے عوام وخواص نے اس لیے بھی قبول کر لی کہ صدیوں سے اس دھرتی پر انسانوں کے اندر مذہبی، تمدنی سماجی اور ذات پات کی طبقاتی تقسیم موجود تھی۔ حتی کہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے بھی اس تقسیم کو ختم کرنے کی کوئی اخلاقی اور مخلصانہ کوشش نہیں کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت سے حکمرانوں نے ایک ایسے طبقے کی ضرورت محسوس کی جو عوام اور حکمرانوں کے درمیان رابطے کا کام بھی دیتا اور عوام کو ان سے دور بھی رکھتا۔ چنانچہ اس منصوبے کے لیے بڑی سمجھداری سے بساط بچھائی گئی۔ ایک طرف نظام تعلیم کے اندر دورنگی پیدا کی گئی۔ دوسری طرف جاگیردار طبقہ تیار کیا گیا۔ اس سے قبل مغل عہد میں زمینیں نسل در نسل منتقل نہیں ہوتی تھیں،۔ یہاں یہ اہتمام کیا گیا کہ نسل در نسل وراثتی زمین کیلئے قوانین مستحکم کیے گئے تا کہ یہ جاگیردار طبقہ مطمئن ہو کر تاج برطانیہ کے ہر جائز و ناجائز حکم کی انجام دہی میں خلوص اور مستعدی دکھائے۔ ملوکیت کے مٹتے ہوئے تصور کو جاگیردارانہ سماج کی ایک نئی شکل میں لاگو کر دیا گیا۔

یہاں پر ایک التزام یہ ملتا ہے کہ جاگیردار طبقہ اگر سماجی برائیوں کا شکار بھی رہے تو خیر ہے کیونکہ اس کی خرابیوں سے انگریز حکومت پر حرف نہیں آئے گا بلکہ مقامی آبادی کا تشخص ہی خراب نکلے گا۔ تیسرا بڑا عنصر بیوروکریسی کی صورت میں ہندوستانی سماج پر لاگو کیا گیا۔ اس میں I.C.S جیسے ادارے سامنے آئے۔ اس ادارے میں تعلیم یافتہ انگریز اور بعد میں مہذب (پڑھے لکھے) ہندوستانی لوگ اس کا حصہ بنے۔ اس میں التزام یہ تھا کہ یہ افراد چونکہ براہ راست انگریز حکومت کے ماتحت آتے ہیں اس لیے ان میں کوئی اخلاقی برائی موجود نہ ہو، تاکہ نوآبادکار کا تشخص مجروح نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد سرمایہ داری کے نظام کو بڑھاوا دیا گیا۔ یہ تمام انتظامات ثابت کر رہے تھے کہ انگریز نے طویل مدتی حکمرانی کا خواب دیکھ لیا تھا۔ اب ان اداروں کو تحفظ دینے کے ساتھ مضبوط بھی بنانا تھا تاکہ عوام پر ان کی بالعموم اور انگریز کی بالخصوص دہشت بنی رہے۔ چنانچہ فوج کے ادارے کو لامتناہی اختیارات دے کر ان کے پیچھے چلایا گیا۔ اس ادے کی دہشت اتنی تھی کہ ہندوستان میں لوگ گورے فوجی کی طرف ڈر کے مارے دیکھ بھی نہ پاتے کہ کہیں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ اختیارات میں عوام پر گولی چلانے کے احکامات کا اندازہ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کرنیوالے جنرل ڈائر کے واقعے سے لگایا جا سکتا ہے جس کو بعد میں بڑے اعزازات بخشے گئے۔ ان اقدامات نے مختلف فرقوں کو مذہبی ٹکڑوں، لسانی گروہوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کے مسائل میں مزید اضافہ کیا۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں:

> ''نوآبادیات میں بھی طاقت اور اختیار کو برابر وسعت دینے کی انمٹ پیاس ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف سیاسی اطاعت پر اکتفا نہیں کرتی۔ یہ محکوم آبادی سے ثقافتی اطاعت شعاری کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ چونکہ یہ تقاضا سیاسی اطاعت کے مقابلے میں بڑا ہے کہ سیاسی اطاعت میں نئے طرزِ حکمرانی کے خلاف بغاوت نہ کرنے کا عہد ہوتا ہے، جبکہ ثقافتی اطاعت شعاری کا مطالبہ انسانی وجود کے ان حصوں کو سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور کرتا ہے جو صدیوں کے پھیر میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔۔۔ ثقافتی اطاعت گزاری کی راہ میں متعدد اور پے در پے مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ نوآبادیاتی نظام ان مشکلات کا پیشگی اندازہ کر لیتا ہے، اس لیے انہیں دور کرنے کے ہمہ گیر اقدامات کرتا ہے۔ یہیں سے ایک نئی تاریخی سیاسی صورت حال، طاقت کے نئے رشتے، ایک نیا کلچر وجود میں آتے ہیں۔ مابعد نوآبادیات اس صورت حال اور اس سے وابستہ طاقت کے رشتوں کا مطالعہ کرتی ہے۔''**(۵)**

.....

مقامی افراد کے استحصال کے لیے اس عہد میں جاگیرداری اور سرمایہ داری جیسے بڑے

ادارے سامنے آئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام جو یورپ کا خاصا تھا اس کو صنعتی انقلاب کہہ کر یہاں مسلط کیا گیا۔ جہاں پر مقامی کاریگر چرخوں اور گھر کی کھڈی پر دیسی کپڑا بناتے وہاں پر صنعتی پرزوں نے یہ کام سنبھال لیا۔ مقامی صنعت اور فن کو بے وقعت کر دیا گیا۔ یہ نئی تبدیلی ساحر لدھیانوی کے لیے قابلِ قبول تب ہوتی جب یہاں لگنے والی ملوں/ فیکٹریوں میں بُنے جانے والے سوتی، ریشی کپڑے سے مقامی فرد کا تن ڈھانپا جاتا لیکن افسوس ایسا نہ ہوا۔ ملیں دن رات تیزی سے کپڑا بُن رہی تھیں اور بحری جہازوں کے لشکر یہ تمام مصنوعات یورپ کی منڈیوں تک پہنچا آتے۔ ان ملوں میں کام کرنے والے مزدور کو کپڑا تو کیا ملتا، اسکی بھوک بھی ختم نہیں ہوسکی۔ اتنی صنعتی ترقی سے جب برصغیر کے افراد کی ظاہری اور معاشی حالت سدھر نہ سکی تو یہ زاویہ ساحر کی نظموں میں ان الفاظ میں سامنے آیا۔

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں ! کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں؟
چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا ! کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں؟

زمیں کی قوتِ تخلیق کے خدا وندو!
ملوں کے منتظمو ! سلطنت کے فرزندو !(۶)

اس استحصال میں جاگیردار کا کردار زیادہ سفاکی کا حامل ہے۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت اور بغاوت کا عنصر ساحر کی زندگی کے ایک تلخ واقعے سے جڑا ہوا ہے۔ اس واقعے سے انکی شخصیت کا اہم زاویہ سامنے آتا ہے کہ اس طبقے سے ساحر کی نفرت محض نظریاتی جگالی نہ تھی بلکہ وہ خود اس کا شکار ہوئے تھے۔ فارغ بخاری اپنے ایک مضمون ''لدھیانے کا پھل'' میں لکھتے ہیں،

> ''ساحر لدھیانے کا پھل تھا۔ حمید اختر اور ابنِ انشا اس کے لنگوٹیے اور سکول فیلو تھے۔ وہ ایک جاگیردار کا بیٹا تھا، جس نے اپنی امارت کی آبرو رکھنے کے لئے کئی شادیاں کر ڈالی تھیں کہ اس طبقے کی یہی رِیت تھی۔ پھر ایک دن اس نے کسی نوجوان بیوی کے بھرے میں آکر ساحر کی ماں کو گھر سے نکال دیا، اور ساحر کو بھی، جو اس کی ڈھیر ساری بیویوں میں اکلوتی اولاد تھی۔ ساحر کا سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق یہ پہلا تجربہ تھا۔ ایسا تلخ تجربہ جس کا گہرا گھاؤ اس کے لئے زندگی بھر نفرت کی علامت بنا رہا۔(۷)

نوآبادیاتی عہد میں شریفوں اور معصوم مقامی افراد کو تنگ کرنے اور ان کو دبا کر رکھنے کے لیے معاشرے کے بدعنوان، بدطینت اور انگریز کے حاشیہ بردار طبقوں کو زمینوں کی ملکیت دے کر عوام اور حکمرانوں کے درمیان ایک

پُل بنایا گیا۔ یہ پل برے وقت کے لیے حکمرانوں کی ڈھال بھی ثابت ہوا۔ یہ طبقہ عوام کو حکمرانوں کی غلامی کے لیے ہر ہر طریقے سے جھکانے کی کوشش کرتا۔ حتیٰ کہ پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں میں کام آنے کے لیے اس طبقے کی مدد سے جوان کڑیل دیسی نوجوان فوجی بھرتی کر کے یورپ کے ملکوں کی حفاظت کیے لیے بھیجے جاتے۔ اس طرح ہندوستان کا بہترین نوجوان جوتن کی محنت سے اپنے ملک کو ترقی دے سکتا تھا انگریز حاکموں کی جنگ میں کام آیا۔ بدلے میں اس کے گھر والوں کو چند بیگھے زمین دے دی جاتی۔ اس ساری دلالی کے لیے مقامی جاگیردار طبقہ حکمرانوں کے لیے کارآمد رہا۔ نظم پر چھائیاں کا یہ ٹکڑا انہی سفاک تاریخی حوادث کی داستان سناتا ہے:

انسان کی قیمت کرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے
چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے
بستی کے سجیلے شوخ جواں بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے، اس راہ پہ راہی جانے لگے
ان جانے والے دستوں میں غیرت بھی گئی برنائی بھی
ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے، بہنوں کے چہیتے بھائی بھی (۸)

بھائی یا بیٹا جو کہ گھرانے کا معاشی سہارا بن سکتا تھا جب غیروں کی جنگوں کے کام آیا تو معاشرے میں اس جسم فروشی کے آسیب کا دور دورہ ہوا جس نے اس مہذب معاشرے کی مقدس فضا میں جنسی وحشیت، یا وحشی جنسیت کے ناسور کو بڑھاوا دیا۔ عورت کی جوانی کے خریدار افراد بھی دراصل اسی طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے جو جاگیرداری اور سرمایہ داری سے منسلک تھا۔ اس جاگیردار کے تحفظ کے لیے حکمرانوں نے وراثتی اصول بنائے تا کہ اس طبقے اور اس کے آنے والی نسلوں کو بے فکر کر کے استحصال کا وہ نظام جاری رکھا جا سکے جو حکمرانوں کے اپنے فائدے میں تھا۔ اس طبقہ اشرافیہ کی اہمیت اس امر سے زیادہ واضح ہوتی ہے کہ ۱۸۲۰ء میں مدراس کے گورنر منرو نے اس طبقے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اپنی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ اس طبقے کو ختم کرنے کی بجائے اس کو جاری رکھنا چاہیے ہو لکھتا ہے:

''ہمیں ہر قیمت پر زمینداری کو برقرار رکھنا چاہیے... اس وجہ سے مقامی طبقہ اشرافیہ باقی رہے گا اور معاشرہ میں جو طبقاتی تقسیم ہے وہ بھی رہے گی۔ اگر زمینداری ختم ہو گئی تو نچلے طبقے کی حالت خراب ہو جائے گی اور ہماری حکومت ان کی وفاداری کمزور ہو جائے گی۔''(۹)

جاگیرداروں کو اپنی اہمیت اور دہشت کا ادراک تھا چنانچہ وہ ہر طرح کے جرائم میں بے لگام داخل ہوتے چلے گئے۔ اس استحصال میں مزدور، کسان، کے ساتھ ساتھ جو طبقہ ظلم کا شکار ہوا ہو اس غریب کسان کی بیٹی تھی جو

تقدیس مشرق کا ایک نمونہ ہوا کرتی تھی۔ ساحر لدھیانوی جاگیردار کے کردار کے بارے میں یہ الفاظ ادا کرتے ہیں۔

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرات ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر میری ہیبت کا فسوں جاری ہے (۱۰)

ہندوستان کی ایک خوبی کثیر اللسانی خطہ ہونا ہے اور دوسرا کثیر المذاہب۔ اس دھرتی پر بدھ مت، عیسائی مت، ہندومت، پارسی مذہب، اسلام و دیگر مذاہب اپنی خوبصورت تعلیمات کے ساتھ موجود ہیں۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان مذاہب کی انسان دوست تعلیمات سے یہ خطہ امن و آشتی کا مرکز بنتا لیکن خدا، دیوتا یا بھگوان اور انسان کے درمیان ایک طبقہ صدیوں سے حائل ہے اور وہ ہے مذہبی پیشوائیت۔ مذہبی پیشوائت کو اس استحصالی نظام کے خلاف مزاحمت کرنا چاہیے تھی لیکن یہ طبقہ انسان کے حقیقی دکھوں کا مداوا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ شکست وریخت سے پُر معاشرے کو مذہبی قیادت نے مایوس کیا، نتیجتاً مذہب سے بیزاری کا عنصر معاشرے کا حصہ بنا۔ انفرادی سطح کے شعور کی بدولت کسی کسی طبقے میں یہ بیزاری الحاد کے درجے کو بھی پہنچی نظر آتی ہے۔ ساحر لدھیانوی ایسے ہی مذہت بیشتر رویوں کی ترجمانی ان شعروں کی صورت کرتے نظر آتے ہیں:

بیزار ہے کنشپ وکلیسا سے اک جہاں سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نو دیروحرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر (۱۱)

نو آبادیاتی عہد کے مذکورہ ہتھکنڈوں سے برصغیر کے عام فرد حکمرانوں کے شکنجے میں تو آ گیا تھا لیکن اس جبر و استبداد کے باعث معاشرے میں سماجی، سیاسی اور معاشی سطح پر مصنوعی انداز سے کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی چلی گئیں۔ یہ تبدیلیاں سماجی بگاڑ کی علامت بنیں۔ ان میں سماجی سطح پر یہ تبدیلی آئی کہ وطن کی اجلی فضا میں پیلے شگوفے اگنا شروع ہوئے جنہوں نے اجلی فضا کو تاراج کرنا شروع کیا۔ معاشرے سے قناعت کا عنصر ختم ہونا شروع ہوا۔ اس سے قبل ذخیرہ اندوزی کا رجحان نہ تھا، اب ذخیرہ اندوزی شروع ہوئی۔ جب ایک ہاتھ نے رزق ذخیرہ کیا تو اس امر نے لاکھوں افراد کو بھوکا کر دیا۔ مقامی افراد کے ہنرمند ہاتھ کاٹے گئے اور مشینوں نے ان ہاتھوں کی جگہ سنبھالی تو گھر گھر غربت اور مفلسی کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس بھوک نے جوان بیٹوں کو غیر کی جنگوں کا ایندھن بنایا۔ ان بیٹوں اور بھائیوں کی موت نے زندہ بہنوں کو جسم فروشی پر مجبور کر دیا۔ یہ بیٹی، یہ بہن غیر ملکی حاکموں سے لے کر مقامی استحصالی نمائندوں کے ہاتھ جسم کا تار تار علیحدہ کرواتی رہیں۔ محبت جو نزاکتوں اور لطافتوں کا جذبہ تھا، مجروح ہوا۔

غرض سماجی سطح پر ایسی ہلاکت کا ماحول طلوع ہوا جو نوآبادیاتی عہد سے قبل کے عہد سے زیادہ سنگین تھا۔ سماجی سطح پر دو بڑے طبقے وجود میں آئے جن میں ایک انگریز حکمران تھے دوسرے مقامی اشرافیہ۔ ان طبقوں نے عوام کا رزق سمیٹ کر غریب بچوں کے چہروں پر زردی مل دی۔

انگریز حکمرانوں نے شروع عہد میں عیسائی مشینری مقاصد کو باقاعدہ اپنی سیاسی حکمت عملی کا حصہ بنائے رکھا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد کی پالیسی میں مذہبی افراد اور مقاصد پشت پناہی کا فیصلہ ختم کیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ کسی بھی مذہبی فرقے/عقیدے یا فرد کی حمایت کرنے سے انگریز کا سیکولر امیج داغدار نہ ہونے پائے۔ چنانچہ کسی بھی مذہب کی تعلیمات اور پیشوائیت کی متنوع صورتوں کو نہ چھیڑنے کی پالیسی نوآبادیاتی حکومت میں شامل کی گئی۔ اس عدم دلچسپی سے گو عیسائی مشنری کے مقاصد تو متاثر ہوئے لیکن باقی مذاہب کی پیشوائیت کو بھی آزادی نصیب ہوئی۔ جس کو کھلی چھٹی کہا جائے تو یہ بھی مناسب ہے۔ چنانچہ ہندوستان کا اَن پڑھ طبقہ ان آقاؤں کے رحم و کرم پر چلا گیا۔ اس طبقے نے فرد کے اندر سے محبت اور اپنی حالت کے بدلنے کے جذبے کی رہی سہی کسر بھی ختم کر دی۔ ہستی کی بے ثباتی جیسے موضوعات فرد کی زندگی میں داخل ہوئے۔ عام فرد کے اندر عمل کی قوت کو یہ کہہ کر سلا دیا گیا کہ مقدر کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ چنانچہ تصورِ تقدیر کی ناروا توضیح نے معاشرے میں بے عملی کو فروغ دیا جس سے محکوم قوم بربادی کی شاہراہ پر گامزن ہوگئی۔ ترقی پسند ادیب اور مفکر ہونے کی وجہ سے بھی ساحر کے ہاں مذہبی طبقے کی استحصال پسندی کا بخوبی ادراک ملتا ہے۔ حمید اختر نے اپنے ایک مضمون ''ساحر کی یاد میں'' میں ان کے سیاسی اشکار اور عمل پسندی کا جائزہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

> ''سیاسی طور پر ساحر بہت صاف ذہن کا مالک تھا۔ تحریک پاکستان کے دوران اس نے بھی ہماری طرح کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی ہدایت پر قیام پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا، مگر وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ ہمارا اصل کام پاکستان بننے کے بعد شروع ہوگا کیونکہ اس وقت جاگیردار اور مولوی مل کر لوگوں کا استحصال کریں گے اور اپنے حقوق مانگنے والے محنت کشوں سے کہیں گے کہ تم اس پیغمبر کی امت ہو جس نے پیٹ پر پتھر باندھ کر محنت کی۔ تم بھی اس سنت پر عمل کرو اور زیادہ معاوضہ مت مانگو۔'' **(۱۲)**

اس منظر نامے میں ساحر لدھیانوی ایک طنز نگار بن کر سامنے آتے ہیں۔ اپنی نظموں میں جب وہ ایک طناز کے روپ میں سامنے آتے ہیں تو فکر و خیال کی تلخی شدت سے محسوس ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ طنزیہ پیرائے کو واضح کرتی ہوئی یہ سطریں، ان نوآبادیاتی حقائق کی بہتر تصویر پیش کرتی ہیں۔ نظم 'صبح نوروز' کا شعر پارہ یوں ہے،

نکلی ہے بنگلے کے در سے

اک مفلس دہقان کی بیٹی　　افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی　　آنچل سے سینے کو چھپاتی
مُٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے (۱۳)

اوپر کی ساری بحث سے قاری کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ساحر لدھیانوی نے اپنی نظموں میں محض ایک طنز نگار کے طور پر مابعد نوآبادیاتی عہد کے ہندوستان میں پھیلی یا پھیلائی گئی تبدیلیوں کو ہوتے ہوئے دیکھا ہے بلکہ ایک مفکر اور بڑے فن کار کے طور پر اپنا نظریہ فن بھی انہیں نظموں میں پیش کیا ہے۔ سماجی اور معاشرتی ابتری کے مختلف مظاہر میں شاعر ایک فنکار کی درداری اور معاسرے میں اس کے مثبت کردار کو سامنے لاتا ہے۔

ساحر لدھیانوی کی یہ نظم پارے ان افکار کی توضیح پیش کرتے ہیں جو ساحر نے ایک شاعر کے لیے ضروری خیال کیے۔ ان نظموں پاروں سے ان کا نظریۂ شعر/نظریہ فن بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ نظم میرے گیت تمہارے ہیں کے یہ اشعار بھی نظریہ فن کی ایک بہترین مثال بنتے ہیں:

تم سے قوت لے کر، اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا!
تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا!
آج سے میرے فن کا مقصد، زنجیریں پگھلانا ہے!
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا! (۱۴)

ساحر لدھیانوی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے گہرا تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں انسان دوستی اور مزدور، کسان، طوائف جیسے مظلوم کرداروں کے استحصال کے مختلف موضوعات فطری طور پر در آئے ہیں۔ نظموں کے موضوعات اور جوشیلے آہنگ سے ان کا لہجہ جاندار، توانا اور تلخ ہو جاتا ہے جو اردو شاعری میں خاصے کی چیز ہے۔ ساحر کی شاعری میں ہمیں کسی جگہ فیض احمد فیض کی ترقی پسند شاعری کے مماثلتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ مماثلتیں الگ سے ایک تفصیلی مضمون کی متقاضی ہیں۔ ترقی پسند ادیب ہونے کے باوصف اشتراکیت اور روسی ادب و ادیب کے ان کا فکری رابطہ ہونا لازمی بات تھی۔ کیونکہ اس عہد میں ترقی پسند ادیبوں کو کارل مارکس کے نظریات اور ان کی عملی تعبیر کے حامل ملک روس سے خاصی دلچسپی تھی۔ ساحر کی روسی ادیبوں سے دلچسپی اور انسیت پر بات کرتے ہوئے فکر تونسوی نے ان کا ایک خاکہ تحریر کیا تھا جس کا اقتباس درج ہے:

''آخری نوٹ: ابھی ابھی تمہارے نام کا خط ختم کر کے بیٹھا ہی تھا کہ ایک نئے پرچے میں سے روس کے مشہور انقلابی شاعر میکافسکی کی بڑی سی تصویر مجھے دکھائی دی۔

میکافسکی کی اس تصویر کے ایک کونے میں تمہاری چھوٹی سی تصویر بھی تھی جسے دیکھ کر
مجھے محسوس ہوا جیسے تمہاری تصویر میکافسکی کی تصویر کا ایک حصہ ہو، اہم حصہ، تم یہ تو
جانتے ہو کہ میکافسکی نے خودکشی کر لی تھی لیکن میکافسکی کی تصویر کا حصہ بن کر کیا تم بھی
خودکشی کرنا چاہتے ہو؟ نہیں پھر یہ میکافسکی کے ساتھ مناسبت کیوں؟ **(۱۵)**

اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ساحر نے ان تمام مسائل کو موضوع بنانے کے بعد فنکار کے طور پر اپنا نہ صرف نظریہ فن واضح کیا ہے بلکہ رجائیت کے ساتھ ایک نئے جہان کی امید پیش کی ہے۔ اس امید نے شاعر کو جینے کا جواز فراہم کیا ہے اور اسی حوصلے کے ساتھ ساحر دوسروں کو امید بھرے مستقبل کی نوید دیتے ہیں۔ یہ نوآبادیاتی مغالطہ کہ غیر ملکی حاکم مہذب ہیں اور مقامی آبادی وحشی و غیر مہذب، ساحر کے الفاظ کے تیر نشتروں سے غلط ثابت ہوتا ہے اور وہ بڑے اطمینان اور جرأت کے ساتھ اپنی نظم ''وحشی انگریز'' میں نام نہاد مہذب حکمرانوں کو وحشی اور غیر مہذب قرار دیتے ہیں کہ ہماری سرزمین بابا گرونانک اور مہاتما بدھ کی دھرتی ہے اور یہ کہ ان ہستیوں کی وارث قوم غیر مہذب ہو ہی نہیں سکتی۔ اور انہی شعروں میں یہ اثبات بھی واضح کیا جا رہا ہے کہ جس خون پر ایک عرصے سے وحشی قوم پالی جا رہی تھی، اس کے خلاف آج یہ شاعر بغاوت کرتا ہے۔ یہ خون نئی نسل کی آرزو اور امنگوں سے بھرے مستقبل کی امانت ہے جس پر آئندہ کوئی وحشی نوآبادکار پالا نہ جا سکے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس پر عزم رجائیت میں جزئیہ حریت چھپا ہوا ہے۔ ساحر کے اسی حریت پرست لہجے کی سچائی اس کے لہجے کی بلند آہنگی کو مضبوط فکری، فنی اور ترقی پسندانہ جرأت کی مستحکم اساس فراہم کرنے کا باعث بنی ہے۔ اس شاعری کو مزاحمتی اردو شاعری کے ساتھ ساتھ، ردِنوآبادیاتی رجحان کے طور پر اہم مقام حاصل رہے گا۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ایڈورڈ سعید، ''ثقافت اور سامراج''، مترجم، یاسر جواد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۹، ص ۱۱۴
۲۔ ساحر لدھیانوی، ''تاج محل''، مشمولہ تلخیاں، رابعہ بک ہاؤس، لاہور، ص ۴۳۔۴۲
۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''برطانوی راج (ایک تجزیہ)''، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۴۹
۴۔ ساحر لدھیانوی، ''مادام''، مشمولہ تلخیاں، ص ۸۲
۵۔ ناصر عباس نیئر، ''مابعد نوآبادیات، اردو کے تناظر میں''، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص ۸
۶۔ قحطِ بنگال، مشمولہ تلخیاں، ص ۴۸
۷۔ فارغ بخاری، ''لدھیانے کا پھل''، مطبوعہ ماہنامہ ''ماورا انٹرنیشنل''، لاہور، اشاعت اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۳۳
۸۔ پرچھائیاں۔ مشمولہ تلخیاں، ص ۱۰۱
۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''برطانوی راج''، ص ۸۱
۱۰ جاگیردار، مشمولہ تلخیاں، ص ۸۰
۱۱۔ طرح نو، مشمولہ تلخیاں، ص ۴۱
۱۲۔ حمید اختر، ''ساحر کی یادیں''، مطبوعہ ماہنامہ ''ماورا انٹرنیشنل''، لاہور، اشاعت اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۴۶
۱۳۔ صبح نوروز، مشمولہ تلخیاں، ص ۳۴
۱۴۔ مرے کھیت تمہارے نہیں، مشمولہ تلخیاں ص ۷۶
۱۵۔ فکر تونسوی، ''شہزادہ''، خاکہ مطبوعہ ماورا، ص ۴۱